R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29

Annual Rs. 4/-

Per Copy -/12 P

جلد ۲۶ - شمارہ ۴ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ جنوری ۱۹۶۷ء

اداریہ

اردو کی بقا اور ترقی کے لیے ضروری کام

ہم برسوں سے کہتے آئے ہیں کہ اردو کی بقا اور ترقی کا مسئلہ کئی محاذوں پر کام کرنے سے حل ہوگا۔ ہم ان محاذوں کا ان کی اہمیت کے مطابق ذکر کرنا پھر ضروری سمجھتے ہیں۔

چونکہ ہمارے دستور نے ہم کو کچھ حقوق دیے ہیں، چونکہ اس میں اقلیتوں کی زبان، تہذیب اور دوسرے مخصوص عناصر کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے، چونکہ لسانی اقلیتوں کے مسئلے کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے، چونکہ ہر زبان کی جو کہ ملک میں یا کسی ریاست میں استعمال ہوتی ہے، کاغذات داخل کرنے کی ضمانت دی ہے، چونکہ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دینے کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے، چونکہ اس بات کی گنجائش ہے کہ جس ریاست میں کسی زبان کے بولنے والے معتدبہ تعداد میں ہوں اس ریاست میں اس زبان کو بھی سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے اور چونکہ اردو جو ایک قومی زبان ہے اور اس کے بولنے والے ملک میں کروڑوں کی تعداد میں ہیں اور جو ایک شاندار ادبی سرمایہ رکھتی ہے اور ہماری تاریخ کے ہر اہم موڑ پر ہماری زندگی کی ترجمانی کرتی رہی ہے، دستور کے دیے ہوئے تمام حقوق کے مطابق اور سیکولرزم اور جمہوریت کے تمام مسلّم اصولوں کے مطابق اور گاندھی جی اور نہرو اور دوسرے رہنماؤں کے ارشاد کے مطابق ایک ایسی جدید ہندوستانی زبان ہے جس کو اس کا حق ابھی تک نہیں ملا ہے اس لیے حکومت کا فرض ہے کہ اس کی بقا و ترقی کے لیے پورے پورے انتظامات کرے اور اس طرح کرے کہ ان کے عمل میں آنے میں کسی طرح کی رکاوٹ نہ ہو سکے۔

حکومت کو اس کا فرض یاد دلانا، اس کو عوام کے ایک بڑے طبقے کے جذبات و خیالات سے خبردار رکھنا اور عوام کی ہمدردی حاصل کر کے حکومت کو مناسب قدم اٹھانے کے لیے آمادہ کرنا، سب اردو دوستوں کا ہی نہیں، تمام وطن دوستوں اور قومی کارکنوں کا فرض ہے۔

یہ تو ہوئی حقوق کے مطالبے کی بات اور یہ مطالبہ اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک اسے مان نہ لیا جائے، خواہ اس میں کتنی ہی دیر کیوں نہ ہو اور خواہ اس میں بظاہر کتنی ہی سستی، بے نیازی، بے پروائی، بے حسی سے سابقہ کیوں نہ پڑے۔ ویسے حالات بتا رہے ہیں کہ حکومت کو بھی اب اس طرف توجہ ہو گئی ہے لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ احکام کتنے ہی اچھے اور مفید کیوں نہ ہوں، اصل چیز ان پر عمل ہے، اور دستور میں درج سارے حقوق گلدستۂ طاق نسیاں ہو سکتے ہیں اگر قوم میں عمل صلاحیت نہ ہو اور حکومت اور عوام عمل کے لیے مناسب اقدامات نہ کریں اور تمام عملی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے راہیں نہ نکالیں، اپنے مطالبات پر اصرار ضروری ہے مگر ہرگز ہرگز کافی نہیں ہے۔

مطالبات پر اصرار اور پیہم اصرار ضروری ہے اور اس وقت تک ہونا چاہیے جب تک یہ مطالبات مان نہ لیے جائیں، مگر کافی اس لیے نہیں کہ آج کے دور میں حکومت کا اعلان ہی سب کچھ نہیں ہوا کرتا، اس اعلان پر عمل کرانے کے لیے خلوص کے علاوہ ریاضت اور سعی پیہم کی بھی ضرورت ہے اور چھوٹے بڑے ہر محاذ اور ہر ادارے اور ہر حلقے اور ہر سطح پر ضرورت ہے۔ مثلاً حکومت ہند آج دفعہ ۳۴۷ کے تحت دہلی، یو۔پی اور بہار میں اردو کو بھی سرکاری زبان قرار دے دے تو محض یہ اعلان کافی نہ ہوگا بلکہ ہمیں اس دفتری اور سرکاری علاقے سے اس پر عمل کرانا ہوگا جو ملک کے دفاع، ملک کی تعلیم، ملک کی اقتصادی ترقی، ملک کی پیداوار کے سلسلے میں بھی خاصا سست رہا ہے اور جس کی کارکردگی کسی طرح قابل تعریف نہیں کہی جا سکتی۔

اس لیے جس طرح دوسرے قومی اور سماجی کاموں کے لیے ہر شہری کو اپنا فرض بھی ادا کرنا ہے، اسی طرح اردو کی بقا اور ترقی کے لیے اردو دوستوں کو بھی اوّل تو اپنے زبان و ادب پر ایسا عقیدہ پیدا کرنا ہے جو کسی دشواری یا دقت سے متزلزل نہ ہو سکے۔ پھر اس کے لیے ایسا آہنی عزم پیدا کرنا ہے جو ایک مستقل آنچ بن جائے اور یہ آنچ کبھی دھیمی نہ ہو سکے۔ اس کے بعد بڑے پیمانے پر خیالی پلاؤ پکانے اور دوسروں سے توقع کرنے کے بجائے کہ وہ سب انتظامات کر دیں گے، خود ہر چھوٹے سے چھوٹے کام میں، مثلاً ابتدائی تعلیم کے انتظام کرنے میں، ثانوی منزل پر سہولتیں مہیا کرنے میں، دفاتر میں عرضیوں کے

سلسلے میں، کتابوں کی تیاری اور اساتذہ کی فراہمی کے سلسلے میں اردو ٹرسٹ قائم کر کے سرکاری کارکنوں سے کام لے لیتا ہے اور خود بھی اسکول قائم کر کے، مقامی حضرات کا تعاون حاصل کر کے اور وسائل مہیا کر کے اپنے طور پر بھی بہت کچھ کرتا ہے۔

حکومت سے حقوق انگیے مگر اس کے ساتھ اپنے طور پر دشواریوں کے باوجود، خود بھی ہر طرح کے اسکول قائم کیجیے اور چلائیے اور سیدھے ترکیبیے کر اردو کے ذریعہ سے ہی ہم ملک و قوم کی صحیح خدمت کر سکتے ہیں تو بالآخر آپ کو کامیابی ضرور ہو گی۔ اس وقت ہمیں یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کے سہارے سے چلنا ہے۔

حضرت کلیم احمد آبادی کی وفات

گجرات کے مشہور و ہردلعزیز صوفی منش شاعر حضرت کلیم احمد آبادی مورخہ ۲۹ر دسمبر ۱۹۶۷ء کو انتقال فرما گئے ہیں۔ وصال کے وقت عمر ۹۰ سال تھی۔ حضرت کلیم صاحب مرحوم نے پچھلی نصف صدی تک شعر و ادب کی جو گراں مایہ خدمت انجام دی ہے اس نے آپ کو گجرات کے علمی و ادبی حلقوں میں کافی ہردلعزیز بنا دیا تھا۔ آپ کی ان ہی خدمات کے اعتراف میں گجرات کے سابق گورنر نواب مہدی نواز جنگ اور احمد آباد کے سربرآوردہ ہندو، مسلم شہریوں، گجراتی کے صحافیوں، ادیبوں، شاعروں اور ملی کارکنوں نے ۱۹۶۱ء میں شاندار طریقہ پر آپ کا جشن منایا تھا۔ آپ کا مجموعۂ کلام "متاع کلیم" شائع ہو کر ملک کے ادبی اور ادبی حلقوں میں کافی ہردلعزیزی حاصل کر چکا ہے۔

(جاوید انصاری)

بیگم عطیہ فیضی کی وفات

اخبارات میں یہ خبر نظر سے گزری کہ ماہ رمضان میں بمبئی کے قریبی مقام ریاست جنجیرہ کی ایک مشہور خاتون بیگم عطیہ فیضی جو عرصے سے ترک وطن کر کے کراچی میں اقامت گزیں تھیں ۸۰-۹۰ سال کی عمر میں ایک اسپتال میں اس دنیا سے سدھار گئیں۔

بیگم فیضی کا شمار کسی زمانے میں ہندوستان کی انتہائی روشن خیال مسلم خواتین میں ہوتا تھا۔ اس وقت کی نسوانی تحریکات میں یہ پیش پیش رہتی تھیں مرحومہ صاحب تصنیف بھی تھیں اور ان کا سفرنامہ یورپ اس سلسلہ میں خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

حضرت صدق جائسی کی وفات

کانپور۔ دنیائے ادب میں یہ خبر انتہائی رنج و غم کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۲ر جنوری کی شام کو اردو کے معمر شاعر حضرت صدق جائسی کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم کو مقبرہ گوال ٹولی کانپور میں سپرد خاک کیا گیا۔

صدق صاحب تقریباً ۲۷ برس تک نظام صاحب کے درباری شاعر رہے اپنا آخری دور شاعری کو پہنچ کر ختم کیا۔ مرحوم نے حیدرآباد کے درباری واقعات ایک کتابی شکل میں بعنوان "دربار دربار" قلم بند کیے ہیں جس پر اترپردیش گورنمنٹ پانچ سو روپیہ بطور انعام پیش کر چکی ہے۔ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر عظیم عطا کرے۔

(سیاست جدید کانپور)

آغا اشہر لکھنوی کا انتقال

سیتاپور۔ لکھنؤ کے مشہور ادیب اور شاعر آغا اشہر لکھنوی ۱۱ر جنوری کو یہاں انتقال کر گئے۔

مرحوم پیارے صاحب رشید کے عزیز شاگردوں میں تھے اور انھوں نے حیات رشید لکھی ہے۔ گورنمنٹ انٹر کالج جھانسی میں فارسی اور اردو کے لکچرر کی حیثیت سے بڑی خدمت انجام دی تھی۔ بزم نصیر سخن سیتاپور کی طرف سے ایک تعزیتی مشاعرہ ۲۸ر جنوری کو ہو گا۔ (قومی آواز)

عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی کا عرس

نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صدارت کریں گے

آگرہ۔ یہاں ۲ر فروری ۱۹۶۸ء کو نظیر اکبرآبادی کا عرس ہو گا جس کی صدارت کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے درخواست کی گئی ہے۔ اس عرس میں اس عوامی شاعر کی تخلیقات پڑھ کر سنائی جائیں گی عرس کمیٹی نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ نظیر اکبرآبادی کی قبر کو ایک محفوظ یادگار قرار دیا جائے۔ (ملک وملت، دہلی)

اقبال پر پی ایچ ڈی

اردو حلقوں میں یہ خبر دلچسپی کا باعث ہو گی کہ گوہاٹی یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے تحت اقبال پر تحقیق کی گئی ہے۔ مقالہ لکھنے والے تاراچرن رستوگی پرنسپل ایس۔ بی۔ ایم۔ ایس کالج سوالکچی (کامروپ۔ آسام) ہیں یہ مقالہ ڈاکٹر امریش دتہ پروفیسر و صدر شعبۂ انگریزی کی نگرانی میں انگریزی میں ڈاکٹریٹ (D. Phil) کے لیے لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف کو اردو و فارسی شاعری سے غیر معمولی شغف ہے۔ مقالے کا عنوان

THE WESTERN INFLNENCE IN IQBAL

یعنی "اقبال پر مغربی اثر" ہے۔ (سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند شاخ آسام)

چنڈی گڑھ میں ادبی تنظیم کا قیام

چنڈی گڑھ۔ یہاں کچھ سر کردہ اصحاب علم کا ایک جلسہ ہوا جس میں باتفاق رائے ساہتیہ اکاڈمی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی۔ اس میں اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی کے شعبے ہوں گے جو ان زبانوں میں تصنیف و تالیف کا کام کریں گے مرکزی سرکار نے اس ادارہ کو پانچ ہزار روپے سالانہ کی امداد دینے کا یقین دلایا ہے۔ اس کے اردو شعبہ میں فی الحال ذیل کے حضرات نامزد کیے گئے ہیں:-

۱۔ جناب کشمیری لال ذاکر۔ ۲۔ جناب ستیہ پال آنند ۳۔ جناب رشی پٹیالوی ۴۔ مسز دیپ پرتاپ سنگھ ایڈوکیٹ۔ ۵۔ جناب ول جگت سنگھ جوہر (در سلسلہ صبح نو)

ڈاکٹر دھرم چند نیر

حقیقت آئینہ

اردو ادب ۱۹۶۶ء کے پہلے شمارے میں ہما میرٹھی کا ایک مضمون "آئینہ حقیقت" شایع ہوا ہے یہ مضمون میرے مضمون سرور اور شاکر مطبوعہ اردو ادب شمارۂ اول بابت سال ۱۹۶۵ء کے جواب کے طور لکھا گیا ہے اگرچہ اس کا جواب لکھنے کی ضرورت نہ تھی لیکن چونکہ ہما صاحب نے شاکر کی طرفداری میں اس قضیے کو طول دینے کی خواہش کی ہے اس لیے یہ دل ناخواستہ یہ چند سطریں لکھی جارہی ہیں

میں نے اپنے مضمون میں تاریخ ادب اردو مولفہ رام بابو سکسینہ "خمخانۂ جاوید" مولفہ لالہ سری رام ہندوؤں میں اردو از سید رفیق مارہروی اور یادگار رفتگاں مولفہ جگر بریلوی سے ایک ایک اقتباس درج کیا تھا جن میں یہ بتایا گیا تھا کہ سرور جہاں آبادی کا بہت سا کلام "کسی صاحب" یا "دوسروں" کے نام سے شایع ہوا ہے۔

ہما صاحب فرماتے ہیں کہ ان اقتباسات میں کلام سرور کے "کسی صاحب" کے نام سے چھپنے کا ذکر ہے لیکن شاکر صاحب کے نام نامی کا ذکر نہیں آیا اس لیے یہ کیسے فرض کرلیا گیا کہ سرور کا کلام شاکر کے نام سے چھپا ہے۔

اگرچہ پہلے تین اقتباسات میں شاکر صاحب کا نام مذکور نہیں تھا لیکن "زمانہ" میں شایع شدہ خط و کتابت اور زمانہ، العصر و الناظر لکھنؤ کے مضامین کالیداس کے رتو سنگھار کا منظوم ترجمہ وغیرہ کے اتنے حوالے موجود تھے (ان مضامین اور خطوط کے اہم اقتباسات میرے مضمون میں بھی درج ہیں) کہ ذرا غور سے پڑھنے سے بآسانی معلوم ہوسکتا تھا کہ "کسی صاحب" سے مراد منشی پیارے لال شاکر میرٹھی سابق ایڈیٹر ادیب و پروپرائٹر العصر لکھنؤ کی ذات گرامی ہے یادرفتگاں مولفہ جگر بریلوی کی تحریر میں شاکر میرٹھی صاحب کا نام جلی حروف میں درج تھا چنانچہ اس اقتباس کی چند سطریں دوبارہ درج کی جارہی ہیں۔

"آپ (سرور) کی بے شمار رباعیاں مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی کے نام سے شایع ہوئیں۔ انھیں نظموں میں ایک مجموعہ اکسیر سخن ہے جو کالیداس کے رتو سنگھار کا منظوم ترجمہ ہے"

اس کے بعد ہما صاحب رتو سنگھار کے منظوم ترجمہ اکسیر سخن کی شان نزول کے متعلق فرماتے ہیں۔

"شاکر صاحب نے رتو سنگھار کا اردو منظوم ترجمہ ۱۹۱۳ء میں کیا تھا جب سرور کو مرے ہوئے پورے تین برس بیت چکے تھے ظاہر ہے شاکر صاحب پلانچیٹ کرتے نہیں جو سرور مرحوم کی روح کو پلانچیٹ کی طشتری پر بلوا کر اس سے رتو سنگھار کا ترجمہ کروالیتے ہوں۔ شاکر صاحب نے ۱۹۱۳ء میں رتو سنگھار کا ترجمہ کیا اور اسی برس اسے شایع بھی کروادیا۔ اس منظوم ترجمہ کی کچھ نظمیں ایک دیوار گیر کلنڈر کے لیے کہی گئی ورقوں پر تصنیف ہوئی نظمیں جو ۱۹۱۳ء کا ہے انھیں اوراق پر شاکر صاحب نے منظوم ترجمہ کا خاکہ بنایا اور اسے نظم کا قالب دیا۔"

چونکہ ہما صاحب شاکر صاحب کے حالات اور کمالات سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں اس لیے اس ضمن میں میں خود کچھ نہ کہتے ہوئے رتو سنگھار کی شان نزول اور سال تصنیف کے متعلق شاکر صاحب کے بیانات درج کیے دیتا ہوں "تاکہ آئینۂ حقیقت کی حقیقت معلوم ہوجائے۔ شاکر صاحب لکھتے ہیں۔

"ترجمہ کے لیے رتو سنگھار کا انتخاب کیا چنانچہ میں نے کلکتہ اور بمبئی سے متعدد انگریزی اور ہندی ترجمے بھی رتو سنگھار کے منگائے جب رتو سنگھار کا نثر ترجمہ ہوچکا تو اس کو نظم کرنے کی فکر ہوئی۔ خریف کا موسم قریب تھا لہٰذا سب سے پہلی نظم یہی کہی گئی۔ سرور مرحوم سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوچکا تھا۔ لہٰذا میں نے درخواست کی کہ آپ ان نظموں کو دیکھ لیا کریں اور انھوں نے منظور کرلیا۔"

شاکر صاحب کی درخواستیں بھی (جو ان کے خطوط میں موجود ہیں) ملاحظہ ہوں۔

خط عدد ۱ مورخہ ۲۷ جون ۱۹۰۹ء مکرمی سرور صاحب۔ تسلیم

کالیداس سنسکرت کے مشہور ملک الشعراء کی چند نظموں کا اردو ترجمہ نثر موجود ہے۔ اب جب آپ کی طرف سے سلسلہ جاری ہو تو ادھر سے برابر مصالحہ ارسال ہوتا رہے گا۔ آپ کسی طرح کا خیال نہ فرمایئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میرے ساتھ معاملہ کرنے میں آپ کی ذات کو مجھ سے کبھی رنج نہ پہنچے گا۔

خاکسار شاکر میرٹھی

خط عدد ۲ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۰۹ مکرمی جناب سرور زاد لطفہٗ

کالیداس کی نظموں کے باب میں کیا رائے ہے میرے خیال میں آپ نے اس سلسلہ کو پسند تو ضرور کیا ہوگا..... کالیداس کی نظموں کے بارے میں آپ کی رائے کا از حد منتظر ہوں۔

خاکسار شاکر

خط عدد ۳ مورخہ ۷ اکتوبر ۱۹۰۹ء مکرمی سرور زاد لطفہٗ

اب ذرا جلدی جلدی تمام مضامین ختم کریں تاکہ اور مضامین ارسال کروں۔ کالیداس کی نظمیں بھی جلد ختم کرنے کی فکر کیجیے

خاکسار شاکر

رتو سنگھار کی نظمیں سب سے پہلے کب اور کہاں شایع ہوئیں اس کے متعلق بھی شاکر صاحب کا بیان ملاحظہ ہو۔

---

[1] ہما میرٹھی آئینۂ حقیقت اردو ادب میں شمارہ نمبر ۱ بابت ۱۹۶۶ء

[2] پیارے لال شاکر میرٹھی ضمیمہ العصر لکھنؤ بابت ستمبر ۱۹۱۲ء ص ۱

[3] پیارے لال شاکر میرٹھی ضمیمہ العصر لکھنؤ بابت ستمبر ۱۹۱۲ء ص ۲

"میں لکھ چکا ہوں کہ زمانہ میں اکسیرِ سخن کی تین نظمیں سرور مرحوم کی زندگی ہی میں شائع ہو گئی تھیں۔ ۱۹۱۰ء میں جب حسرت والی نظم زمانہ میں شائع ہوئی اس وقت جناب سرور کانپور ہی میں ایڈیٹر زمانہ کے مہمان تھے۔"

شاکر صاحب جو ان نظموں کے مصنف ہونے کے مدعی ہیں لکھتے ہیں کہ یہ نظمیں ۱۰-۱۹۰۹ء میں لکھی گئی تھیں اور سرور جہان آبادی ان نظموں کے مصنف نہیں، اصلاح کرنے والے تو تھے ہی۔ لیکن ہما صاحب فرماتے ہیں کہ یہ نظمیں ۱۹۱۳ء میں لکھی گئی تھیں۔ شاکر صاحب اور ہما صاحب کے بیانات میں تضاد ہے۔

رہا یہ سوال کہ یہ نظمیں ۱۹۱۲ء کے کلنڈر کے اوراق پر کیوں لکھی گئی تھیں؟ یہ کوئی پیچیدہ بات نہ تھی جس تک ہما صاحب کی دیدہ ور نظریں نہ پہنچ سکتیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہما صاحب نے اس پر غور نہیں فرمایا بات دراصل یہ تھی کہ شاکر صاحب شاعر تو تھے ہی نہیں لیکن انھیں شاعر بننے اور کہلانے کا بہت ہی زیادہ شوق تھا اس لیے انھوں نے کلنڈر کو استعمال کیا۔ سفید کاغذوں پر نظمیں لکھوا کر گھر کی دیواروں پر چسپاں کرنا کچھ اچھا نہ لگتا۔ اس لیے کلنڈر پر لکھ کر آویزاں کر دی گئیں تاکہ کلنڈر کا کلنڈر رہے اور شاکر صاحب کی نام نہاد شاعری کا اشتہار بھی۔

اسی بیرے میں ہما صاحب منشی پریم چند کے نام کی دہائی دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"منشی پریم چند نے اس رد تو نگھار، پر جو دیباچہ لکھا ہے وہ اس امر پر (کس امر پر؟) کافی روشنی ڈالتا ہے۔ ظاہر ہے منشی پریم چند شاکر صاحب کے ہمسایہ بھی تھے، ساتھ اٹھتے بیٹھتے بھی تھے اور بارہا ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ وہ اس وقت شاکر صاحب کے پاس موجود تھے جب شاکر اس رد تو نگھار کو اردو نظم کا قالب پہنا رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ منشی پریم چند نے بیس پچیس صفحات کا مقدمہ لکھ کر شاکر صاحب کو پیش کر دیا"

آئینہ حقیقت ص ۸

ہما صاحب کے اس بیان میں پریم چند کے مقدمہ کو چھوڑ کر باقی سبھی باتیں سو فیصدی غلط بیانی پر مبنی ہیں۔ اس لیے کہ اول تو پریم چند اور شاکر صاحب کبھی ہمسایہ نہ تھے۔ نہ ان کا ساتھ کا اٹھنا بیٹھنا تھا اسی طرح یہ بھی سراسر غلط ہے کہ جب رد تو نگھار کا منظوم ترجمہ ہوا اس وقت پریم چند شاکر صاحب کے پاس موجود تھے۔ کیونکہ شاکر صاحب اپنے بیان[1] کے مطابق جون ۱۹۰۷ء میں کانپور آئے تھے اور منشی پریم چند جون[2] ۱۹۰۸ء میں کانپور سے تبدیل ہو کر مہوبہ چلے گئے۔ رد تو نگھار کی نظمیں (بقول شاکر صاحب) اکتوبر ۱۹۰۹ء اور اکتوبر ۱۹۱۰ء کے درمیانی عرصے میں لکھی گئی تھیں تو کیا شاکر صاحب جیتے جاگتے منشی پریم چند کو اڑن کھٹولے پر مہوبہ سے کانپور بلا کر نظمیں لکھتے وقت اپنے پاس بٹھا لیا کرتے تھے (اس زمانہ میں تو کانپور اور مہوبہ کے درمیان ریل گاڑی بھی نہیں چلتی تھی) اگر ہما صاحب کی تحقیق (کہ یہ نظمیں ۱۹۱۲ء کے کلنڈر کے ورقوں پر لکھی گئی تھیں اس لیے ان کا زمانہ تصنیف ۱۹۱۳ء ہے) کے مطابق یہ فرض بھی کر لیا جائے تو بھی یہ معمہ حل نہیں ہے کیونکہ شاکر ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ میں "العصر" نکال رہے تھے اور منشی پریم چند اس وقت مہوبہ میں سب ڈپٹی انسپکٹر اسکول کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اگر لکھنؤ منشی پریم چند کے حلقہ میں ہوتا تو بھی یہ مان لیا جاتا کہ جب شاکر صاحب رد تو نگھار کی نظمیں لکھنے کے موڈ میں ہوتے ہوں گے تو پریم چند اسکولوں کے معائنے کے بہانے لکھنؤ آ کر اور شاکر صاحب کے پاس بیٹھ جاتے ہوں گے لیکن سرکاری کاغذات سے یہ ہرگز پتہ نہیں چلتا کہ لکھنؤ بھی ۱۹۱۳ء میں مہوبہ ڈویژن میں ایک قصبہ رہا ہو۔ اگر ہما صاحب شاکر کے سوانح حیات کے ساتھ پریم چند کے حالات بھی دیکھ لیتے تو مجھے امید ہے کہ ان کی تحقیق بے بنیاد نہ ہوتی۔

رہی اکسیرِ سخن کے دیباچے کی بات تو ہما صاحب کی اطلاع کے لیے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ منشی پریم چند نے دیباچہ لکھ کر پیش نہیں کر دیا تھا بلکہ شاکر صاحب کی بارہا درخواستوں پر یہ مقدمہ لکھنا منظور کیا تھا مزید برآں جب انھیں حقیقت حال کا علم ہوا تو انھوں نے منشی دیا نرائن نگم کو نہایت افسوس کے ساتھ لکھا۔

"مشفق من تسلیم آپ نے سرور مرحوم کے نام جو خطوط اور حضرت شاکر کے جو مسودے میرے پاس بھیجے تھے انھیں دیکھنے کے بعد مجھے آپ سے کلی اتفاق ہے کہ ان نظموں کے اصلی مصنف سرور ہیں۔ تعجب ہے کہ اردو کے طبقۂ مصنفین میں اس قسم کی بدعتیں ہوتی ہیں کیسی حسرت کا مقام ہے کہ اردو پبلک کی ناقدردانی نے ایسے خوش بیان سخن ور کو قلیل نفع کے لیے ان ضرورتوں پر مجبور کیا۔ آپ نے میرے دیباچہ میں جو ترمیم فرمائی ہے وہ بہمہ وجوہ مناسب ہے کاش مجھے پہلے علم ہوتا تو میں ہرگز دیباچہ لکھنے کے لیے قلم نہ اٹھاتا۔ والسلام پریم چند"

رد تو نگھار کی نظمیں لاجواب ہیں یا سہل ممتنع ہیں اس میں شاکر صاحب کس طرح داد کے مستحق ہو گئے۔ اس داد کے مستحق تو سرور جہان آبادی ہیں جو ان نظموں کے خالق ہیں۔ یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ شاکر صاحب نے زندگی میں کتنے ہی جرم اور گناہ کیوں نہ کیے ہوں لیکن شعر کہنے کے گناہ کے مرتکب وہ اپنی ستر برس کی زندگی میں ایک بار سے زیادہ نہیں ہوئے فصیح الہند ابوالحیاں ادیب العصر منشی پیارے لال شاکر میرٹھی نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۱۰ء میں اپنا ایک شعر درج فرمایا ہے۔ جس کے وہ بلا شرکت غیرے واحد مالک ہیں اس شعر کو ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے درج کر رہا ہوں اس سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ شاکر صاحب پر کیسے کیسے شعر نازل ہوتے تھے۔ ملاحظہ ہو

تم مجھ سے پوچھتے ہو میں نے کیسے دیکھا — سنبھالو سنبھالو نہیں تو میں گرا

(باقی صفحہ پر)

۱۔ ڈاکٹر قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار ص

۲۔ ایضاً ص

۱۔ زمانہ بابت جنوری ۱۹۱۵ء سرور اور شاکر ص ۲۸

میرا چہرہ اور لوگ

بدیع الزماں خاور

دُرخشاں دُرخشاں، منوّر منوّر

میرا چہرہ
روشن ہے سورج سے بڑھ کر!
مگر لوگ جب دیکھتے ہیں مجھے
تو —

مرا تابناک و ضیا پاش چہرہ
نظر ان کو آتا ہے صرف ایک دھبہ
جو میرے تعلق سے ان کا بیاں ہے
مجھے اس پہ کوئی تعجب نہیں ہے
میں لوگوں کے انداز پہچانتا ہوں
میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں
کہ وہ
ختم کر دیتے ہیں پہلے، قربت
مٹاتے ہیں دل سے نقوشِ محبت
مجھے —
اتنی دوری سے پھر دیکھتے ہیں
جو ہوتی ہے
اس فاصلے سے زیادہ
زمیں اور گردوں کے جو درمیاں ہے
مجھے اس پہ کوئی تعجب نہیں ہے
جو میرے تعلق سے ان کا بیاں ہے
میں لوگوں کے انداز پہچانتا ہوں!!

نوشتہ

بشیر انور

سال ہر سال
بہر حال
یوں ہی آتے ہیں گزر جاتے ہیں
ہم یونہی نیک تمنائیں کیے جاتے ہیں
سال، جو کہلائیں بہاروں کے نقیب
ایسے روٹھے ہیں کہ بس منہ بھی دکھلاتے نہیں
اور سال، جنہیں کہیے تمنا کے رقیب
ایسے چمٹے ہیں ہمیں چھوڑ کے جاتے ہی نہیں

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی میں ریسرچ کی رفتار

(شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی میں اب تک جو تحقیقی کام ہو چکا ہے اس کی رپورٹ ذیل میں درج ہے دوسری یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں سے درخواست ہے کہ وہ بھی اپنے شعبہ کی تحقیقی سرگرمیوں کی رپورٹ "ہماری زبان" میں اشاعت کے لیے بھیجیں

ادارہ "ہماری زبان")

شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اب تک مندرجہ ذیل حضرات کو اپنا مقالہ مکمل کرنے پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے:۔

۱۔	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	لکھنؤ کا دبستان شاعری
۲۔	نور الحسن ہاشمی	دلی " " "
۳۔	مسعود حسین خاں	تاریخ زبان اردو
۴۔	آفتاب احمد صدیقی	شبلی
۵۔	محمد عزیر	اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ
۶۔	سراج الحق قریشی	دیوان زادہ "ترتیب مع مقدمہ
۷۔	اکبر حسین قریشی	اقبال کی شاعری میں تلمیحات
۸۔	آمنہ خاتون	دریائے لطافت ترتیب و تدوین مع مقدمہ
۹۔	خورشید الاسلام	غالب۔ ابتدائی دور
۱۰۔	رضی الدین	نظیر اکبر آبادی
۱۱۔	معین احسن جذبی	حالی کا سیاسی شعور
۱۲۔	میمونہ بیگم	مرزا رسوا۔ حیات اور کارنامے
۱۳۔	خلیل الرحمٰن اعظمی	ترقی پسند تحریک
۱۴۔	محمود الٰہی	اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ
۱۵۔	مصاحب علی (قمر رئیس)	پریم چند کا تنقیدی مطالعہ
۱۶۔	قاضی عبد الستار	اردو شاعری میں قنوطیت
۱۷۔	تنویر احمد علوی	ذوق۔ زندگی اور شاعری
۱۸۔	وقار حسن	انیس کی زبان
۱۹۔	مظفر عباس نقوی	وحید الدین سلیم
۲۰۔	معصوم رضا راہی	طلسم ہوشربا میں ہندوستانی زندگی کی جھلکیاں
۲۱۔	ظہور الحسن	برج موہن دتاتریہ کیفی۔ تنقیدی جائزہ

مندرجہ ذیل اسکالرز نے اپنے مقالے پیش کر دئے ہیں

۱۔	جمال شریف	ولی سے پہلے اردو شاعری کی دکن میں نشوونما
۲۔	اسرار سعیدی	حسرت عظیم آبادی۔ زندگی اور شاعری
۳۔	نیر اقبال	اردو قواعد نویسی
۴۔	اسلم رضوی	PHONETICS AND PHONOLOGICAL STRUCTURE OF URDU.

(شعبہ اردو کے ترجمان رفتار سے)

صفحہ ۴ سے آگے

انھیں شاکر صاحب کے بارے میں ہما صاحب لکھتے ہیں کہ کئی نامور شعراء نے ان سے اصلاح لی، مگر انھوں نے کبھی اس کی نمائش نہیں کی۔ غالباً سرور صاحب کا کلام بھی ۔۔۔ دیکھتے رہے تھے۔" ہما صاحب نے شاکر صاحب کے کئی دو نامور شاگردوں میں سے ایک شاگرد پادری تامس شیرنگ ذاکر میرٹھی (جو بیک وقت فصیح، منہد، صوفی، صدیقی، ابوارثی، میرٹھی اور ابوالخیال نادر شاہجہاں پوری سے بھی اصلاح کرواتے تھے) کا نام بتایا ہے اور ان کی ہندوستان گیر شہرت کے پیش نظر شاید اس لیے کہ شاکر صاحب نمائش پسند تھے (حالانکہ شاکر پر یہ بہتان ہے) ہما صاحب نے شاکر صاحب کے دوسرے شاگردوں کا نام درج نہیں کیا ورنہ شاید اردو ادب کے صفحات اس فہرست طویل کے حامل بھی نہ ہو سکتے۔ لیکن ہما صاحب کے دوسرے بیان "غالباً سرور صاحب کا کلام بھی وہ دیکھتے رہے تھے" کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ سراسر بے بنیاد ہے کیونکہ شاکر صاحب اپنے بیانات میں اس کے بالکل برعکس حقیقت کا اعتراف کر چکے ہیں نیز اپنے ملنے والوں کے سامنے بھی وہ اس امر کا اقرار کرتے تھے۔ شاکر لکھتے ہیں

"میں نے سرور صاحب سے درخواست کی کہ آپ ان نظموں کو دیکھ لیا کریں اور انھوں نے منظور کر لیا"

اس سلسلہ میں نوبت رائے نظر لکھنوی لکھتے ہیں

"اس وقت تک میں یہ سمجھتا تھا کہ شاکر صاحب نے حضرت سرور سے تلمذ اختیار کر لیا تھا۔ جیسا کہ ایک آدھ موقع پر خود انھوں (شاکر صاحب) نے فرمایا تھا"

شاکر صاحب تو اقرار کر رہے ہیں کہ انھوں نے سرور کے آگے زانوئے ادب تہ کیا تھا لیکن خدا جانے ہما صاحب اپنے موکل کو ہر بات پر جھٹلانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہما صاحب کے نزدیک معیار اخلاق یہی ہو کہ اپنے اساتذہ کو اپنا شاگرد کہا جائے۔

ہما صاحب آگے لکھتے ہیں کہ تیر صاحب کو حیرت ہے کہ شاکر صاحب چالیس برس تک کیسے خاموش رہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے ان برسوں میں بھی شاکر صاحب نے تراجم، تالیفات، منظوم تصانیف کی ہیں اور وہ شائع بھی ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے کچھ رسالوں کے نام گنائے ہیں جن میں شاکر صاحب کا کلام انھیں چالیس برسوں میں شائع ہوا ہوگا (اگر کچھ چھپا ہوا تو وہ ضرور پوری نشاندہی کرتے)، یہ انکشاف کیا ہے کہ شاکر صاحب کی مشہور ادبی و مذہبی تصنیف "غریب الوطن شاہزادہ" لاہور سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی اور چالیس بندوں کی اس نظم کے آٹھ دس بند درج کیے ہیں۔

شاکر صاحب کے تراجم اور تالیفات سے مجھے کوئی سروکار نہیں لیکن جہاں تک نظم "غریب الوطن شہزادہ" کا تعلق ہے ہما صاحب کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ یہ نظم ۱۹۳۸ء میں لاہور سے چھپی یا نہیں چھپی لیکن یہ نظم ۱۹۱۰ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ دراصل ملٹن کی "پیراڈائز لاسٹ" فردوس گمشدہ کے ابتدائی حصہ کا ترجمہ ہے اور شاکر صاحب اس کے بارے میں اپنے خطوط میں اطلاع دے چکے ہیں۔ لکھتے ہیں

خط مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۰۹ء

مکرمی جناب سرور صاحب زاد لطفہٗ

ملٹن (تاج الشعرائے انگلستان) کی ایک مشہور نظم پیراڈائز لاسٹ یعنی وہ بہشت جو ہاتھ سے جاتا رہا جو میں نے اس کا خلاصہ کیا ہے جو شاید کا ئید اس کی نظم سے کم ہوگا وہ میں آپ کو کسی وقت ارسال کروں گا۔

پیارے لال شاکر

امید ہے کہ شاکر صاحب کے خط کا یہ اقتباس ہما صاحب پر شاکر کی شاعری کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ ہما صاحب نے اپنے مضمون کے صفحہ ۸۳ پر چار رباعیاں اور ص ۸۴ پر دو رباعیاں درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مارچ یا اپریل ۱۹۴۲ء میں شاکر نے چار رباعیاں کہی تھیں اور ایک خط میں میرٹھ میں جناب اختر وارثی کو بھیجی تھیں جو میرٹھ سے ایک پرچہ نکالتے" تھے

اگرچہ ہما صاحب نے جگہ جگہ شاکر صاحب کے حالات و کمالات اور ان کی تصنیفات سے پوری واقفیت رکھنے اور "دیدۂ بینا" سے کام لینے کا دعویٰ کیا ہے لیکن ان کے بیانات کو دیکھ کر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یا تو انھیں شاکر کے بارے میں بالکل کچھ معلوم ہی نہیں یا پھر ان کے "دیدۂ بینا" میں کوئی ... ہے جس کی وجہ سے انھیں تحقیق کے میدان میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں۔ کیونکہ ہما صاحب نے جن چھ رباعیوں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ۱۹۴۲ء میں چھپی تھیں ان میں سے پہلی اور تیسری رباعی زمانہ کانپور بابت جولائی ۱۹۱۱ء میں چھپ چکی ہیں۔ پہلی رباعی ادیب الہ آباد بابت جولائی میں دوسری بار چھپی تھی چوتھی رباعی مخزن لاہور کے مارچ ۱۹۰۸ء کے شمارے میں شائع ہو چکی تھی اور اس رباعی کو شاکر صاحب نے اپنے رسالہ العصر لکھنؤ کے جولائی ۱۹۱۷ء کے شمارہ میں پھر استعمال کیا، پانچویں رباعی زبان دلی کے دسمبر ۱۹۱۰ء کے شمارے شائع ہو چکی تھی۔ بہر حال یہ رباعیاں ۱۹۱۰ء میں کہی گئی تھیں نہ کہ ۱۹۴۲ء مزید براں ۱۹۴۲ء میں اول تو یہ رباعیاں کہیں نہیں چھپی اور اگر چھپی ہیں تو جیسا کہ بتایا جا چکا ہے یہ ۱۹۴۲ء میں کہی نہیں گئی تھیں بلکہ استعمال کی گئی کیونکہ شاکر صاحب کی یہ ایک خاص عادت تھی کہ وہ ۱۹۱۰ء تک اپنے نام سے چھپے ہوئے کلام کو پانچ سات برسوں کے بعد غیر معروف رسائل میں استعمال کر لیا کرتے تھے۔

ہما صاحب لکھتے ہیں کہ شاکر صاحب بڑے باکمال آدمی تھے ہما صاحب کے اس بیان سے کوئی اور متفق ہو یا نہ ہو لیکن یہ خاکسار تو سو فیصدی متفق ہے ان کمالات کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے لیکن شاکر صاحب کی ذات کمالات کا مجموعہ تھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاکر صاحب کے ایک کمال کی طرف ابھی ابھی اشارہ کیا گیا ہے کہ مطبوعہ اشعار کو دوبارہ استعمال کرنے میں کمال رکھتے تھے ان کا دوسرا کمال یہ تھا کہ شعر گوئی کی صلاحیت سے بے بہرہ اور بالکل محروم ہوتے ہوئے بھی انھوں نے سرور جہاں آبادی سے نظمیں لکھوائیں اور اپنے نام سے چھپوا کر شاعروں کے حلقے میں شہرت حاصل کی۔ ان کا تیسرا کمال یہ ہے کہ ۱۹۰۷ء میں جب وہ ... میں مرحوم صاحب کے پاس پہنچے۔

(باقی صفحہ ۱۲ کالم ۲ پر)

مراسلات

کلیم الدین احمد کی شاعری اور اردو دنیا

پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب بحیثیت ناقد دورِ حاضر کی سب سے جلیل شخصیت ہیں۔ ان کے ہمعصر ناقدین نے اردو تنقید، غزل اور شاعری کے بارے میں ان کے خیالات و نظریات کی تردید کچھ اتنی ضروری سمجھی کہ رفتہ رفتہ یہ ایک فیشن بن گئی۔ کچھ عرصے سے اس کا وہی معاملہ تھا جو ہر اُنے فیشن کا ہوتا ہے لیکن ادھر کلیم الدین احمد صاحب ایک دوسرے ہی افق سے طلوع ہوئے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "۴۸ نظمیں" شائع ہوا اور اب دوسرا مجموعہ "۵۰ نظمیں" شائع ہوا ہے۔ ان کے پہلے مجموعے کی اشاعت غیر متوقع ضرور تھی لیکن اردو دنیا کے لیے یہ اتنی غیر متوقع ہوگئی کہ جیسے سورج مغرب میں ڈوبتے ڈوبتے مشرق سے نکل آئے اور دیکھنے والے حیران رہ جائیں حالانکہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جب کسی ناقد کا شاعر ہونا یا کیا یک شاعر ہو جانا کوئی حیرت کی بات نہیں تو کلیم الدین احمد صاحب ہی کے لیے یہ واقعہ اتنا حیرت انگیز کیوں ہوگیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ادبی تنقید میں گذارا ہے جو شعر و ادب سے دلچسپی اور اس کے مطالعے کے بغیر ممکن نہیں۔ ان کے والد بزرگوار شاعر تھے۔ ایسی صورت میں حیرت کی بات تو یہ ہوتی کہ ان کو شعر گوئی کا شوق نہ ہوتا نہ یہ کہ اس طرف انھوں نے کیوں توجہ کی۔

کلیم الدین احمد صاحب کی شاعری کے متعلق فوری ردِ عمل ایک غیر متناسب جذبۂ حیرت و استعجاب کا ہوا جو بجائے خود خاصا عجیب تھا لیکن اس سے عجیب تر وہ زاویۂ نگاہ اور خیالات ہیں جو ان کے کلام پر نقد و تبصرہ میں ظاہر کئے جا رہے ہیں۔ چونکہ یہ بڑی حد تک بیالیس نظمیں پر ہماری زبان مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۶۶ء کے ایک تبصرے میں یکجا ہو گئے ہیں اس لیے ان کے تجزیے کے لیے میں اسی تبصرے کو پیش نظر رکھنا چاہتا ہوں۔

"۴۸ نظمیں کی اشاعت سے اردو دنیا میں "راحت حیرت" کی جو "فراوانی" ہوئی اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ "عدم ہستی" کی صورت پہچاننا مشکل ہو گیا۔ متحیر ذہن جو ان کے تنقیدی خیالات سے مغلوب بھی تھے ان کی تنقید کی طرف از سرِ نو متوجہ ہوئے۔ اردو تنقید اور غزل کے بارے میں ان کے مشہور اقوال، ان کی ناقدانہ سخت گیری، کٹر پن، مغربیت اور انتہا پسندی وغیرہ کی یاد تازہ کی گئی اور باوجود اس کے کہ بعض بنیادی صداقتوں کو نظر انداز کر کے آج تک ان کے تنقیدی فیصلوں کو تسلیم نہیں کیا گیا ان کی شاعری کو انھیں کے معیارِ تنقید سے جانچنے کا زرّیں اصول پیش کیا گیا۔ "ہماری زبان" کے مذکورہ تبصرے کی یہ عبارت اسی کی ترجمان ہے۔

> "اگر کوئی اور شاعر ہوتا تو ہم رسمی طور پر تبصرہ کر کے اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے لیکن کلیم الدین صاحب نے نقد و نظر میں جس بلند نگاہی کا ثبوت دیا ہے اس کے پیش نظر ضروری ہے کہ ہم انہی کے معیاروں پر ان کی نظموں کو بھی پرکھنے کی کوشش کریں۔"

بظاہر یہ جملے بڑے بلند آہنگ معلوم ہوتے ہیں لیکن تنقیدی حیثیت سے بالکل بے حقیقت ہیں۔ پہلا سوال تو یہی ہے کہ اگر کوئی اور شاعر ہوتا تو کوئی تبصرہ نگار رسمی طور پر تبصرہ کر کے اس فرض سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتا تھا؟ دوسرے یہ کہ اگر کلیم الدین احمد صاحب نے نقد و نظر میں بلند نگاہی کا ثبوت دیا ہے تو پھر ان کے تنقیدی خیالات کیوں قابلِ قبول نہیں؟ اگر تنقید میں ان کو سطحی، غیر ہمدردانہ اور مغرب کی کورانہ تقلید سمجھا گیا ہے اور ان سے انکار کیا گیا ہے تو وہ کلیم الدین احمد صاحب کی شاعری کے مطالعے میں دفعتہً بلند نگاہی کا چولا کیسے بدل سکتے ہیں؟ تیسرے یہ کہ جن تنقیدی معیاروں کے تبصرہ نگار خود قائل نہیں ان کو تنقید کی کسوٹی بنانا کہاں تک صحیح ہے؟ اور سب سے آخر میں لیکن سب سے اہم یہ سوال ہے کہ کسی ناقد کی شاعری کو انھیں معیاروں کی روشنی میں پرکھنا کیوں ضروری ہے جو اس نے اپنی تنقید میں پیش کیے ہیں۔

ناقد کے لیے تخلیقی عمل کی نوعیت اور مراحل سے واقفیت ضروری ہے۔ اسی طرح شاعر کو بھی تنقیدی بصیرت کا مالک ہونا چاہئے لیکن دونوں میدان الگ الگ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر اچھا ناقد اچھا شاعر ہوتا، ہر اچھا شاعر اچھا ناقد۔ کچھ اچھے ناقد اچھے شاعر یا اچھے شاعر اچھے ناقد ہو سکتے ہیں لیکن ان کی مثال سے کوئی کلیہ نہیں بنایا جا سکتا اور ایسی مثالوں سے بھی عموماً یہی معلوم ہوگا کہ اگر ناقد ہے تو اس کی شاعری اس کی تنقید کے پایہ کی نہ ہوگی اور اگر شاعر ہے تو اس کی تنقید شاعری کے درجے تک نہ پہنچے گی۔ صرف کلیم الدین احمد صاحب ہی پر کیا منحصر ہے دورِ حاضر کے کئی ممتاز ناقد شاعر ہیں اور ان کی شاعری ان کی تنقید کے معیار کی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری ان کی تنقید کے پایہ کی نہیں ہے لیکن اس فیصلے سے بالخصوص ان کی شاعری کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

کلیم الدین احمد صاحب کی شاعری کو خود ان کے معیارِ نقد سے رد کرنا ان عوامل سے بے خبری کا نتیجہ ہے جو ناقدانہ اور شاعرانہ صلاحیتوں کے الگ الگ بروئے کار آنے سے متعلق ہیں۔ یا پھر یہ ایک غیر تنقیدی حربہ ہے جسے مختلف وجوہ سے کچھ لوگ دیدہ و دانستہ استعمال کرنا چاہتے ہیں اور اس پر خواہ مخواہ تنقید کا رنگ و روغن چڑھا رہے ہیں۔ کیا غالب اور اقبال کی شاعری کی کوتاہیاں بیان کرنے والے ناقد سے یہ تقاضا کیا جا سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر شاعری کر کے دکھائے؟ اگر اتفاق سے وہ شاعر بھی ہے تو کیا محض اس لیے اس کی شاعری قابلِ ملامت قرار دی جا سکتی ہے کہ غالب و اقبال کی تنقید میں اس نے شاعری کا جو معیار پیش کیا ہے اس پر اس کی شاعری پوری نہیں اترتی۔ معیارِ تنقید اور معیارِ سخن کی بحث سے الگ ہٹ کر بھی کیا ہر شاعر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ غالب و اقبال کا ہم رتبہ ہو اور کیا ایسی امتیازی شاعری سے قطع نظر کر کے کسی شاعر کے کلام کی کوئی وقعت نہیں

ہو سکتی؟ اگر ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو صرف کلیم الدین احمد صاحب کی شاعری کے جائزے میں ان کے اثبات پر اصرار کی کیا وجہ ہے؟ تنقید میں ان کی سخت گیری اور انتہا پسندی کے خلاف دل کا بخار نکالنا ہو تو اس کے لیے ان کی تنقید کافی ہے، حالانکہ وہاں بھی محض دل کا بخار نکالنا تنقید نہ ہوگی۔ لیکن ان کی شاعری کی حیثیت بالکل الگ ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا تعین اگر کچھ لوگ ضروری سمجھتے ہیں تو صحیح تنقید کے قابل قبول اصولوں ہی کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ یہی کہنا پڑے گا کہ ہماری تنقید ابھی تنگ ذہنی تعصب، نظر فریب سطحیت اور بیجا اصرار اصول سازی سے آگے نہیں بڑھ سکی اور کلیم الدین احمد صاحب ہی کے بقول اس کا وجود اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر۔

(ڈاکٹر ابو محمد سحر)

یہ شعر کس کا ہے؟

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

حافظ شیرازی کے نام سے مشہور ضرور ہے ان کا تخلص بھی موجود ہے لیکن دیوان حافظ کے کسی نسخہ میں نہیں ملا، اس ردیف و قافیہ کی کوئی غزل بھی دیوان میں موجود نہیں، ایرانی نسخے بھی دیکھ چکا ہوں۔ کوئی صاحب تحقیقی جواب عنایت فرمائیں۔

(ڈاکٹر چاند پوری، دہلی)

ٹی ایس۔ ایلیٹ کی ببلوگرافی

ییل یونیورسٹی (Yale University) کے پروفیسر ڈونلڈ گیلپ "ٹی ایس ایلیٹ کی ببلوگرافی" کے نئے ایڈیشن کے لیے اس پر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ اس مرتبہ اس نئے ایڈیشن میں پروفیسر گیلپ ایلیٹ کے اردو تراجم کی مکمل فہرست بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا میں ان کے لیے ایلیٹ کے مضامین، نظموں اور ڈراموں کے اردو ترجموں کی فہرست تیار کر رہا ہوں۔ میں ان تمام قارئین کا ممنون ہوں گا جو ایلیٹ کے تراجم کی تلاش میں میری رہنمائی کریں گے۔

(رضوان حسین، شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

تین ادبی استفسار

"نگار نامۂ انیس" نامی میری زیر ترتیب کتاب کے لیے تین دریافت طلب باتیں پیش ہیں۔ (۱) میں نے دو تین مختلف مضمونوں اور ایک بار کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ علامہ اقبال انیس کی منظر نگاری بے حد پسند کرتے تھے اور انھوں نے کہا تھا: "قدرت کو بھی ایسی شاندار صبح نصیب نہیں ہوئی ہوگی جیسی کہ انیس نے بیان کی ہے"۔ لفظوں میں ردو بدل کا امکان ہے مگر مطلب یہی تھا جو میں نے اپنی یاد سے لکھا ہے۔ بابائے اردو کے رفیق غلام ربانی صاحب دہلوی کا بیان ہے کہ انھوں نے بھی علامہ اقبال سے منسوب کردہ اسی قسم کا قول پڑھا تھا اور لیکچر میں سنا بھی تھا مگر انھیں بھی یاد نہیں کہ کہنے یا لکھنے والا کون تھا۔ (۲) جنوری ۱۹۲۲ء کے علی گڑھ میگزین میں محبوب الرحمٰن کلیم کا مضمون "میر انیس کی شاعری" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ کلیم صاحب لکھتے ہیں: "اردو کے سب سے زیادہ مقبول شاعر حضرت غالب فرمایا کرتے تھے، میر انیس کے برابر اب تک کوئی شاعر پیدا ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا"۔ میری نظر سے جو چند کتابیں اردو ادب، انیس اور غالب کے متعلق گزری ہیں ان میں کلیم صاحب کے بیان کی کہیں توثیق نہیں ملی اور نہ غالب سے منسوب کردہ قول کا کہیں ذکر ہے۔ مجھے اس کا حوالہ نیز انیس اور غالب سے ملاقات کی تفصیلی سرگزشت چاہیے۔ اگر کوئی صاحب مطلع فرمائیں تو میں ممنون ہوں گا۔ (۳) آخر میں ایک اور بات دریافت طلب ہے۔ نواب مسعود جنگ بہادر (سر راس مسعود) کے حسن کوشش سے اعلیٰ حضرت سلطان نے غالباً ۱۹۳۰ء میں ایک لاکھ روپے اس لیے عطا کیے تھے کہ اردو کے بلند پایہ شاعروں کا کلام صحت اور سلیقے سے شائع کیا جائے۔ اسی رقم سے غالب کے غیر مطبوعہ دیوان کی اشاعت ہوئی تھی۔ دوسری کتاب غالب و ذوق کے متعلق تھی۔ تیسری کتاب مراثی انیس کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ اشاعت سے پہلے مسعود جنگ بہادر نے علامہ علی حیدر صاحب طباطبائی کو، جن کی شہرت گرے کی ایلجی کے منظوم ترجمے کی وجہ سے دائم و قائم ہے، انیس کے مرثیوں کی تصحیح پر مامور کر دیا تھا۔ طباطبائی صاحب ڈھائی سال اردو کی پروفیسری کی بجائے انیس کے مرثیوں کی تصحیح کرتے رہے۔ افسوس کہ طباعت اور کتابت میں غفلت کی وجہ سے شائع شدہ مرثیوں میں بیسیوں نہیں سیکڑوں (بلا مبالغہ سیکڑوں) غلطیاں رہ گئیں اور متعلقہ افراد کی سہل کاری، لاپروائی، فرض ناشناسی اور بے حسی کے کارن سر راس مسعود کی دور بینی بے فیض ثابت ہوئی۔ اب یہ دریافت کرنا ہے کہ علامہ طباطبائی نے مرثیوں کا جو تصحیح شدہ نسخہ تیار کیا تھا وہ کہاں ہے؟ اس کا پتہ لگانے میں میری ساری کوششیں رائیگاں گئیں اور وعدوں کے باوجود یہاں کی کسی بااثر ہستی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ اس تصحیح شدہ نسخے کا ڈھونڈ نکالنا اور کسی بڑے کتب خانے میں محفوظ رکھنا اس لیے اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کبھی اس کام کو سر انجام دینے کی امید نہیں ہو سکتی۔

(ڈاکٹر مسعود حسن)

انجمن ترقی اردو دہلی کے نمائندوں کی فخرالدین علی احمد سے ملاقات

نئی دہلی۔ توقع ہے کہ اردو کے سلسلہ میں مرکزی وزیر تعلیم جناب فخرالدین علی احمد نے جو سفارشات مسز گاندھی کو پیش کی ہیں وہ انھیں منظور کرلیں گی اور دلی یو۔پی اور بہار میں اردو کے آئینی حقوق کے نفاذ اور ان کے تحفظ کے لیے قانونی اقدام کے طور پر صدر جمہوریہ ہند آرڈیننس جاری کردیں گے۔

یہ آرڈیننس کم وبیش اسی نوعیت کا ہوگا جس نوعیت کا وہ سرکلر تھا کہ جو ۱۹۵۸ء میں وزارت داخلہ کی طرف سے جاری کیا گیا تھا اس وقت اس کی حیثیت محض ایک سرکلر کی تھی۔

حال ہی میں انجمن ترقی اردو دہلی کے کچھ ذمہ داروں نے جن میں پنڈت سندر لال، بیگم انیس قدوائی، بیگم حمیدہ سلطان اور بہار ربانی شامل تھے جناب فخرالدین علی احمد صاحب سے ملاقات کی تھی۔ اس سے قبل انجمن کی جانب سے ان مطالبات کا ایک مسودہ ان کی خدمت میں پیش کیا تھا کہ جو اردو والے چاہتے ہیں اس مسودہ کی روشنی میں انجمن کے اراکین نے تبادلۂ خیال بھی کیا اور کچھ باتوں کی وضاحت چاہی تھی انجمن کے وفد نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ بہار اور یوپی میں اردو کے لیے علاقے مخصوص نہ کیے جائیں بلکہ ہر اسٹیٹ کو ایک الگ یونٹ مانا جائے اور جو بھی آرڈیننس جاری ہو اس کا اطلاق پورے یونٹ پر کیا جائے خاص طور پر جناب فخرالدین علی احمد نے اس سے اتفاق کیا کہ

اہم مسئلہ پرائمری سطح پر بچوں کو مادری زبان میں تعلیم کے لیے اسکولوں میں داخلہ کا تھا۔ ۱۹۵۸ء کے سرکلر میں طلبہ کی تعداد متعین کی گئی تھی جو بعد کو کم بھی کردی گئی لیکن اس قید کے سبب اردو کے ساتھ ناانصافی کا مظاہرہ ہوتا رہا ہے۔ وفد نے جناب فخرالدین صاحب پر زور دیا کہ اس قسم کی کوئی قید نہیں ہونی چاہیے۔ اگر ایک طالب علم بھی کہیں ایسا ہے جس کے والدین یہ کہیں کہ اس کی مادری زبان اردو ہے تو اس کی اردو تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے اس مطالبہ پر بھی جناب فخرالدین صاحب نے اصولی اتفاق کرکے غور کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ انجمن کو توقع ہے کہ آرڈیننس میں ان دونوں باتوں کا انتظام ہوگا۔

بہرحال آرڈیننس کے اجراء کے بعد ذیلی امور کے لیے محبان اردو کو چوکنا رہنا ہوگا کیونکہ اس کے بعد سب سے بڑا مسئلہ اساتذہ کی ٹریننگ اور ایسے ہی دوسرے معاملوں سے ہوگا۔ (الجمعیۃ)

جناب حبیب الرحمٰن صاحب معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا اخباری بیان

حیدرآباد۔ اخبارات کی حالیہ ایک اطلاع کے متعلق حکومت آندھرا پردیش نے اعلان جاری کیا ہے کہ ۲۶ جنوری ۱۹۶۷ء سے حکومت کے کوئی (۲۳) دفاتر میں جن کے نام بتائے گئے ہیں سرکاری مواصلت کے لیے انگریزی زبان نہیں بلکہ تلگو زبان استعمال کی جائے گی جن دفاتر میں اس تاریخ سے تلگو نہیں استعمال کی جائے گی ان میں حیدرآباد میونسپل کارپوریشن شامل ہے۔ لیکن ریاست کی دوسری تمام میونسپل کونسلوں میں تلگو بہ طور سرکاری زبان کے جاری کردی جائے گی۔ کہا گیا ہے کہ ریاستی مجلس قانون ساز نے حال میں جو قانون زبان سرکاری منظور کیا ہے یہ حکم اس کے تحت جاری ہوا ہے۔

افسوس ہے کہ حکومت کے اس اعلان کی کوئی مستند نقل مجھے ابھی تک نہیں مل سکی۔ لیکن اخباروں میں جو اطلاع شائع ہوئی ہے اس میں اردو کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ یاد ہوگا کہ انجمن ترقی اردو اور اردو کے بعض دوسرے اداروں کی سخت جدوجہد کے نتیجے میں سرکاری زبان کے قانون میں ایک علیحدہ دفعہ اس غرض سے شامل کی گئی تھی کہ خاص خاص علاقوں میں اردو بھی سرکاری اغراض کے لیے استعمال کی جائے۔ اس لیے حکومت کے اس اعلان میں اردو کا بالکل نظرانداز کیا جانا بہت تعجب خیز ہے۔ اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید ریاستی حکومت اردو کو سرکاری اغراض کے لیے استعمال کرنے سے متعلق قانون میں جو گنجائش رکھی گئی ہے اس پر سنجیدگی سے دھیان دینا ضروری نہیں سمجھتی۔

انجمن ترقی اردو کی مجلس انتظامی کا ایک جلسہ عنقریب طلب کیا جارہا ہے تاکہ حکومت کے اس اعلان سے جو صورت حال پیدا ہوگئی ہے اسے دیکھتے ہوئے ان تدبیروں پر غور کیا جائے جنھیں اختیار کرکے حکومت کو اس بات پر آمادہ کیا جاسکے کہ وہ صرف برائے نام نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اپنا وعدہ پورا کرے۔ اس اثنا میں آندھرا پردیش کے تمام اردو دوستوں اور اردو اداروں سے میری یہ گذارش ہے کہ وہ اس نئی صورت حال کا سنجیدگی سے جائزہ لیں اور اپنے واجبی حقوق کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار ہوجائیں۔

حکومت سے بھی میری یہ گذارش ہے کہ وہ اپنے اوپر بدعہدی کا الزام نہ آنے دے اور اردو بولنے والوں کے جذبات کو اپنا کھلونا نہ بنائے۔ امید ہے کہ ریاستی حکومت ہم لوگوں کو اپنے دلوں پر ایک بھاری بوجھ لیے بغیر آئندہ "یوم جمہوریہ" منانے کا موقع دے گی۔ (حبیب الرحمٰن معتمد اعزازی)

الہ آباد میں اردو ہندی کے مصنفین

الہ آباد کے اردو اور ہندی کے مصنفین نے طے کیا ہے کہ آئندہ مارچ میں مجلس مصنفین کے زیر اہتمام دو روزہ کانفرنس منعقد کی جائے جس میں اردو اور ہندی کے "نئے ادب کے مسائل" پر غور وخوض ہوگا ملک کے مختلف حصوں سے مصنفین شریک ہوں گے اس کانفرنس کے منتظمین میں مسز امرت پنت، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، پروفیسر سید احتشام حسین، امرت رائے، پروفیسر مسیح الزماں، ڈاکٹر رام کمل جین، عباس حسینی، بدری ناتھ تیواری، سریندر پال، پریم کمار دہنا، اجیت پشکل، پروفیسر پرکاش چندر گپت (خوازن) اور جنوری شاد گونیڈا شامل ہیں۔ (ریاست)

انجمن ترقی پسند مصنفین کی چھٹی کل ہند کانفرنس

انجمن ترقی پسند مصنفین کی چھٹی کانفرنس نے جس کے اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۶۷ء سے یکم جنوری ۱۹۶۸ء تک نئی دہلی میں منعقد ہوئے ایک مینی فسٹو متفقہ طور پر منظور کیا ہے۔ اس کانفرنس میں جو تقریباً ۱۴ سال کے وقفے کے بعد منعقد ہوئی تھی، ادیبوں اور دانشوروں کی تنظیم و تخلیق کے مسائل پر کھل کر بحث کی گئی اور ماضی کی خامیوں و کوتاہیوں کا بھی جائزہ لیا گیا۔ کانفرنس میں ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے مختلف زبانوں کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے علاوہ غیر ملکی مہمانوں نے بھی شرکت کی جن میں سوویت یونین کے مرزا ابراہیموف، رابرٹ روزدیسنسکی اور [illegible] منگولیا کے اردنے اور یوگوسلاویہ کی مسز گردز رانا اچک قابل ذکر ہیں۔

کانفرنس کا آغاز ۲۸ دسمبر کو سپرو ہاؤس میں افتتاحی اجلاس سے ہوا جس میں میر مشتاق احمد چیف اگزیکٹو کونسلر دہلی نے خیر مقدم کیا اور بنگال کے ممتاز دانشور پروفیسر نہار رنجن رائے نے کانفرنس کو خطاب کیا۔ کانفرنس کی کارروائی مختلف زبانوں کے ادیبوں پر مشتمل ایک مجلس صدارت نے چلائی، اس مجلس میں اردو کے ڈاکٹر عبدالعلیم اور احتشام حسین، ہندی کے امرت رائے، پی سی گپتا پنجابی کے پروفیسر سجان سنگھ، امرتا پریتم، سنت سنگھ سیکھوں، انگریزی کے ملک راج آنند، اجیت جاریہ، آسامی کے ڈاکٹر بنگالی کے سبھاش مکرجی، گجراتی کے گلاب داس بروکر، ملیالم کے کے دامودرن اور سندھی کے اے جے اتم شامل تھے۔

افتتاحی اجلاس میں انجمن کے سبکدوش ہونے والے سکریٹری کرشن چندر نے رپورٹ پیش کی جس میں انھوں نے ۱۹۵۳ء کی کانفرنس کے بعد سے انجمن کی بے عملی اور تعطل کے اسباب و وجوہ پر روشنی ڈالی۔ اگرچہ کرشن چندر کی رپورٹ خود ان کے الفاظ کے مطابق "آفس سپرنٹنڈنٹ کی رپورٹ" جیسی نہیں تھی، اس کے باوجود انھوں نے اپنی رپورٹ میں نہ صرف گذشتہ کانفرنس بلکہ اس سے بھی پہلے سے ملک کے عام حالات کا جائزہ لیا اور ان اسباب کا ذکر کیا جن کے نتیجے میں ادیب الجھاؤ کا اور ادیبوں کی تنظیم بے عملی کا شکار ہو گئی۔ کرشن چندر نے اپنی رپورٹ کا اختتام ان الفاظ پر کیا "ہم ہمیشہ سماجی طور پر ایک ذمہ دار تحریک رہے ہیں پچھلے تیس برسوں میں ملک کی سب سے اہم تہذیبی تحریک اور مجھے توقع ہے کہ ہم اپنی موجودہ مشکلات سے بھی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکیں گے اس ملک کے ادیبوں اور شاعروں نے ہمیشہ اپنے عوام پر بھروسہ کیا ہے مجھے یقین ہے کہ ہم اپنی پرسکون اور سنجیدہ کارروائیوں کے ذریعہ جو کچھ بھی کریں گے اس سے ہمارے عوام میں اعتماد، امید اور نئی ہمت پیدا ہوگی۔"

کانفرنس کے آخری دن انجمن کا مینی فسٹو منظور کیا گیا، مینی فسٹو کے علاوہ کانفرنس میں انجمن کا دستور اور کئی اہم مسائل پر قرارداد یں بھی منظور کی گئیں۔

کانفرنس کے دوران جدید ہندستانی ادب کے رجحانات، اشاعت کی بدلتے ہوئے حالات میں ادیب کے فرائض و ذمہ داریوں، انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم اس کی کامیابیوں و کوتاہیوں جیسے موضوعات پر سیر حاصل بحث ہوئی۔

(حیات)

لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس

لکھنؤ کے ترقی پسند ادیبوں نے یہاں اپنی ایک کانفرنس میں جو جناب مسیح الحسن رضوی کی صدارت میں یوپی پریس کلب میں ہوئی یہ فیصلہ کیا کہ ترقی پسند ادیبوں کی ایک ریاستی کانفرنس مارچ میں لکھنؤ میں طلب کی جائے کانفرنس کا افتتاح پنڈت آنند نرائن ملا نے کیا۔

یہ کانفرنس منجملہ دیگر امور کے دہلی میں ہونے والی چھٹی کل ہند ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کانفرنس کے بارے میں غور کرنے کے لیے منعقد ہوئی اور اس میں اتفاق رائے سے ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں یہ کہا گیا کہ لکھنؤ کے ترقی پسند مصنفین اس طریق کار کی مذمت کرتے ہیں جو دہلی میں اس چھٹی کانفرنس کو طلب کرنے کے لیے اختیار کیا گیا۔

پنڈت آنند نرائن ملا نے کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے بتایا کہ ۱۹۳۶ء میں جب پہلے پہل انجمن ترقی پسند مصنفین بنی ہے تو وہ اس میں موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ ادب کو زندگی سے قریب لانے کے نعرے میں ادیب اس بات کو بھول گئے کہ ادب محض سیاست نہیں ہے انھوں نے یہ بھی کہا کہ رفتہ رفتہ یہ جماعت نظریہ کے ہاتھوں بک گئی۔

جناب مسیح الحسن رضوی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اپنے زمانے میں انجمن ترقی اردو مصنفین نے نظریاتی اعتبار سے ادب کو فائدہ پہنچایا لیکن پرانے ادیب نئے حالات کو سمجھنے سے قاصر رہے چنانچہ یہ تحریک تعطل کا شکار ہو گئی اور ادب اس کے لیڈروں کی منفعت کا ذریعہ بن گیا۔

کانفرنس نے جناب عثمان غنی کو لکھنؤ شاخ کا سکریٹری اور جناب اوصاف احمد کو معاون سکریٹری مقرر کیا۔

کانفرنس میں منظور ہونے والی قرارداد منظور ہونے سے قبل شہر میں مختلف ادیبوں کے پاس رائے لینے کے لیے بھیجی گئی اور ہندی بنگالی، پنجابی اور اردو کے تقریباً پچاس مقامی ادیبوں نے اس پر دستخط کیے ہیں۔

(قومی آواز)

مخدوم محی الدین کی علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات کو خراج تحسین

حیدرآباد۔ جناب کے برہمانند ریڈی چیف منسٹر نے آج شام جشن مخدوم کی دو روزہ تقاریب کا افتتاح کرتے ہوئے مخدوم محی الدین کو پیار، اخلاص اور ایثار و خدمت کا پیکر قرار دیا اور کہا کہ ایسے مخلص اور ایماندار عوامی خدمت گذاروں کی جمہوریت کے ارتقاء کے لیے شدید ضرورت ہے خواہ ان کا تعلق کسی بھی مکتب خیال سے ہو۔ سروجنی دیوی ہال میں ان یادگار تقاریب کا آغاز آج شام اقبال کے ترانہ سے ہوا جسے ڈاکٹر حکیم اور ساتھیوں (فائن آرٹس اکیڈیمی) نے پیش کیا۔ جناب عابد علی خاں صدر استقبالیہ کی خیر مقدمی تقریر کے بعد چیف منسٹر نے ان تقاریب کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ وہ مخدوم سے تقریباً طور پر دس سال سے واقف ہیں عوام بالخصوص غریب طبقات کے لیے ان کی خدمات نہایت شاندار ہیں۔ قانون ساز کونسل، مختلف تقاریب، شخصی ملاقاتوں اور دیگر مواقع پر جب بھی وہ مخدوم سے ملے ہیں ان سے بے حد متاثر ہوئے ہیں مجھے بڑی خوشی ہے کہ آج کی اس تقریب کے افتتاح کے لیے مجھے دعوت دی گئی ہے جس میں مخدوم کی علمی ادبی اور تہذیبی خدمات کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ خدا سے میری دعا ہے کہ مخدوم کی عمر دراز ہو، وہ صحت مند اور خوشحال رہیں اور عوام کی بہتر سے بہتر خدمت کرتے رہیں۔ ان کی صحت مند اور تعمیری تنقیدوں سے حکومت بھی اپنی غلطیوں کی اصلاح کر سکتی ہے۔

نواب مہدی نواز جنگ بہادر سابق گورنر گجرات نے مخدوم کی گلپوشی کی اور ان کے مکمل کلام کے مجموعہ "بساط رقص" کی رسم اجراء انجام دی۔ جناب عابد علی خاں نے چیف منسٹر کی گلپوشی کی جناب ایل این گپتا رسم اجراء انجام دینے والے تھے لیکن ڈاکٹروں نے مشورہ دیا ہے کہ وہ ابھی گھر پر ہی آرام کریں۔ (جناب گپتا گذشتہ کچھ عرصہ سے علیل ہیں) مخدوم کی گلپوشی مختلف تہذیبی، ادبی اور ٹریڈ یونین اداروں کی طرف سے کی گئی معتمد استقبالیہ جناب میر حسن نے صدر جمہوریہ ہند، صدرنشین کمیونسٹ پارٹی ایس اے ڈانگے، سفیر روس متعینہ ہند، نواب علی یاور جنگ وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی، فیض احمد فیض، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر عبد القادر سروری، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر عابد حسین، گوپی چند نارنگ، مالک رام، اسکندر علی وجد، نریش کمار شاد، اسلام مچھلی شہری، ظ انصاری، اور شان الحق حقی، کے پیامات پڑھ کر سنائے جن میں مخدوم کی خدمات اور شاعری کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ مشہور آرٹسٹ عبد الرحمن چغتائی نے اپنے پیام میں لکھا ہے کہ مخدوم نے ہم آرٹسٹوں کے ذہنوں کو فرسودگی سے بچا رکھا ہے یہ قدرت کی عجب ستم ظریفی ہے کہ ہم چاند میں تو مل سکتے ہیں لیکن اس دنیا میں نہیں مل سکتے۔" مخدوم کی شخصیت اور فکر و فن کے عنوان پر لکھے گئے مضامین پر آج رؤف خلش اور حسن فرخ کو جناب عابد علی خاں مدیر سیاست اور جناب بیدھ ویر جی مدیر ملاپ کی جانب سے ایک ایک سو کے انعامات دئے گئے۔ صدر جلسہ سجاد ظہیر نے انعامات تقسیم کئے۔ ہندی پرچار سبھا، مرہٹی ساہتیہ پریشد، کرناٹک ساہتیہ پریشد اور انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی جانب سے مخدوم کی شخصیت اور شاعری کو خراج تحسین پیش کیا گیا اور ان کی گلپوشی کی گئی جناب بیدھ ویر جی ایڈیٹر ملاپ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مخدوم کے شعر کی زبان عام فہم اور انداز بیان سادہ اور دلنشین ہے وہ حقیقی معنی میں عوامی شاعر ہیں۔ مرزا شکور بیگ نے کہا کہ مخدوم کی شخصیت ہمہ گیر ہے وہ یک فرد نہیں بلکہ ایک انجمن ہیں۔ سجاد ظہیر نے اپنی صدارتی تقریر میں مخدوم کی شخصیت اور فکر و فن کا جائزہ لیا۔

آخر میں خود شاعر مخدوم نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا میری شاعری کا پیمانہ اپنا انداز ہے لیکن عالمگیر نقطہ نظر کی ترجمانی ملے گی میر حسن معتمد استقبالیہ نے شکریہ ادا کیا۔ رات میں کلچرل پروگرام منعقد کیا گیا۔

"اردو میڈ" کو جشن مخدوم کے ادبی اجلاس میں ملک کے ممتاز ادیبوں نقادوں اور دانشوروں نے اپنے مضامین اور تقاریر کے ذریعہ مخدوم کے فکر و فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا اور شعر و ادب کے لیے ان کی گراں مایہ خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کی صدارت چند گھنٹہ کی ناگزیر مصروفیت کی وجہ سے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور ڈاکٹر پریم چند سیوہ بابر پر مشتمل مجلس صدارت نے ادبی اجلاس کی صدارت کی۔ ابتداء میں کنوینر ادبی اجلاس جناب سرینواس لاہوٹی نے خیر مقدم کیا۔ بانو طاہرہ سعید اور ناز جبیں نے منظوم خراج تحسین ادا کیا ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اپنی تقریر میں کہا کہ مخدوم کی زندگی کا مقصد ان کی شاعری کا محور بھی ہے وہ چوٹی کے شاعر ہی نہیں چوٹی کے لیڈر اور ٹریڈ یونینسٹ بھی ہیں۔ تلوار کو قلم اور قلم کو تلوار میں تبدیل کرنے کا ہنر انھیں خوب آتا ہے۔ ان کے یہاں آرزو ہے غم آرزو نہیں ان کی شاعری میں قنوطیت کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ شہریار کا ڈاکٹر مس جی نے اپنے مضمون اور جناب مرزا شکور بیگ نے اپنی تقریر میں بہت سی پرانی یادوں اور محبتوں کا تذکرہ کیا۔

پروفیسر عالم خوندمیری نے کہا کہ مخدوم نے ہنستے ہنستے پرانے بتوں اور پرانے اداروں سے نفرت کرنا سکھایا اور بغاوت کے لیے نئے ذہنوں کو آمادہ کیا۔ یہ ان کا اہم کارنامہ ہے۔ انھوں نے شاعروں اور لکھنے والوں کی نئی نسل کو اس طرح بیحد متاثر کیا۔

جناب اختر حسن نے کہا۔ اگر مخدوم سیاست سے وابستہ نہ ہوتے تو ان کی شاعری کا ارتقاء رک جاتا سیاست اور عوامی تحریکوں سے وابستگی نہ ہوتی تو ان کی شاعری کھیتوں سے ہو کر بساط رقص تک نہ پہنچتی۔

زینت ساجدہ نے مخدوم پر مضمون پڑھا جس پر انھوں نے اپنے خاص اسٹائل میں مخدوم کی شخصیت کو زبردست خراج تحسین

ادا کیا۔

علی سردار جعفری نے کہا کہ مخدوم کی غنائی شاعری میں ان کے سیاسی نظریات پیوست ہیں۔ آج کے زمانے میں شاعر سیاست سے دامن نہیں بچا سکتا۔ مخدوم کی تنہائی مجرد تنہائی نہیں یہ تنہائی اچھی اور جاندار ہے۔ احساس کے بغیر اچھی شاعری ممکن نہیں۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کہا کہ مخدوم کی شخصیت پہلودار ہے اس لیے ان کے فکر و فن کا جائزہ لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ "سرخ سویرا" کی شاعری میں خطیبانہ انداز کے پیوند بھی ملتے ہیں وجہ یہ ہے انھوں نے اپنی سیاسی معرکوں کی وجہ سے کم لکھا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری عمر کے ساتھ ترقی کرتی رہی ہے۔ ان کے یہاں دل کی گرمی، جذبہ، صلاحیت فکر، بصیرت اور انسان دوستی ملتی ہے۔

مخدوم کی جدید دور کی شاعری میں علامتوں اور اشاروں کا استعمال ملتا ہے۔ اسے سراہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مخدوم کی نظم "چاند تاروں کا بن" فیض کی شاہکار نظموں "سیاسی لیڈر" اور "ایک ملاقات کی شام" کی ہم پلہ ہے۔

بھارت چند کھنہ، اندرا دھن راج گیرجی اور ڈاکٹر پونم چند سیوریا نے بھی خراج تحسین ادا کیا۔ مسز نواس لاہوٹی کے شکریہ پر ادبی اجلاس کی کارروائی اختتام کو پہنچی۔ (سیاست)

یوپی میں لسانی اقلیت کمشنر کا تقرر

اردو کو فروغ دینے کیلئے حکومت یوپی کے اقدامات

لکھنؤ۔ حکومت یوپی نے ریاست میں لسانی اقلیتوں کے مخصوص مفاد کی دیکھ بھال کے لیے خاص طور پر اردو بولنے والوں کے واسطے ایک لسانی اقلیت افسر مقرر کیا ہے۔ جناب گوپی ناتھ سریواستو اکو اس نئے عہدہ پر تعینات کیا گیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اردو زبان کی ترقی و تحفظ کے سلسلے میں متعدد برسوں سے جو کام جاری ہے اس میں اس نئے اقدام سے مزید تقویت ملے گی۔

اس وقت بھی اردو کے معیاری ادیبوں کو ہر سال معیاری کتابیں تصنیف کرنے پر انعامات دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ غالب ایوارڈ (۱۵۰۰۰ روپیہ اکبر الٰہ آبادی ایوارڈ (۱۲۰۰۰ روپیہ، ہاسپل ایوارڈ (۸۰۰۰ روپیہ اور ۵۰۰۰-۵۰۰۰ روپیہ کے پانچ اور انعامات دیے جاتے ہیں۔

تعلیمی اداروں میں پرائمری اسٹیج سے اردو زبان سیکھنے کے لیے سہولتیں دی جاتی ہیں چنانچہ پرائمری اسکولوں میں جہاں کم سے کم دس طلبا اردو پڑھنا چاہتے ہیں یا کسی درجہ میں کم سے کم دس طلبہ اردو پڑھنے والے ہوتے ہیں تو انھیں اردو کے ذریعہ ہی تعلیم دی جاتی ہے سہ لسانی فارمولے کے تحت طلبا اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے لے سکتے ہیں۔ پرائمری اسٹیج کے علاوہ اگر کسی درجہ میں کم سے کم دس طلبا اردو پڑھنا چاہتے ہیں تو متعلقہ اداروں کو ان کے لیے اردو کی تعلیم کے انتظامات کرنا ہوتے ہیں۔ (قومی آواز)

(صفحہ ۸ سے آگے)

محروم صاحب نے انھیں اپنی تازہ ترین نظم "موت کا موسم" سنائی۔ شاکر صاحب کو یہ نظم اتنی پسند آئی کہ انھوں نے تلوک چند محروم سے کسی رسالے کو بھیجنے کے لیے مانگ لی اور رسالہ زبان دہلی بابت جون ۱۹۰۸ء کو بھیج دی لیکن کمال یہ دکھایا کہ محروم صاحب کے نام سے نہیں بلکہ منشی پیارے لال شاکر میرٹھی کے نام سے بھیج دی۔ چونکہ شاکر صاحب مختلف رسائل میں سب ایڈیٹر اور ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اس لیے رسائل کو ترتیب دیتے وقت یہ کمال بھی دکھاتے تھے کہ اچھی اور پسندیدہ نظم پر خاص اپنا نام یعنی منشی پیارے لال شاکر میرٹھی لکھوا دیا کرتے تھے اور بیچارہ شاعر محروم صاحب کی طرح منھ تکتا رہ جاتا تھا۔ شاکر صاحب کے ایک کمال کے متعلق خواجہ سائل حیدری اور مینائی گوالیاری لکھتے ہیں۔

"شاکر صاحب بسلسلہ مقدمات (دیوانی و فوجداری) لکھنؤ میں سزا ہو چکے تھے چنانچہ عدالت مجاز گوالیار کی طلبی پر سنٹرل جیل لکھنؤ سے پولیس گارد کے ساتھ شاکر صاحب پابہ جولاں (یعنی ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پہنے) گوالیار آئے اور یہاں کی عدالت سے بھی چھ ماہ (صرف) کا حکم سنا کر ان کو واپس لکھنؤ کیا گیا۔
(بشکریہ ہما میرٹھی، "آئینہ حقیقت" اردو ادب، شمارہ اوّل بابت سال ۱۹۶۶ء)

اخبار ریاست کے دفتر سے دو دو پیسے کی ٹکٹیں چراتے ہوئے شاکر صاحب کے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کی داستان کمال سناتے ہوئے دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر و مالک ریاست لکھتے ہیں

"نواب بھوپال نے جب ایڈیٹر ریاست پر مقدمہ دائر کیا تو دفتر ریاست کے متعدد ملازم خرید لیے گئے ...... ان لوگوں میں مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی سابق ایڈیٹر ادیب و العصر بھی تھے ...... شاکر صاحب نے جب غداری کی اور بطور سرکاری گواہ عدالت میں تشریف لائے تو آپ پر مسٹر برج بہاری نوگلی نے جرح کی جرح میں آپ نے شاکر صاحب کے بچپن سے لے کر اس زمانہ تک کے تمام حالات دریافت کیے تو شاکر صاحب نے مجسٹریٹ کے سامنے حلف لیتے ہوئے اقرار کیا کہ میں دو بار عدالتوں سے چوری کے جرم میں ایک ایک یا دو دو سال کی سزا پا چکا ہوں۔"

شاید یہی کمالات ہیں وہ جن کے پیش نظر ہما صاحب لکھتے ہیں کہ شاکر صاحب کی پرخلوص طبیعت بے لوثی، انسانیت پرستی، ادب نوازی، صبر و شکر، معصومیت اور فرشتہ صفتی بطور ضرب المثل استعمال کی جاسکتی ہے۔ میں ہما صاحب سے صرف اس قدر پوچھنے کی گستاخی کروں گا کہ کیا یہ اصطلاح معاشرہ و تہذیب یا کس ملک میں استعمال کی جاتی ہے۔

مقدمہ دیوان سنگھ مفتون، ناقابل فراموش ص ۱۵۷

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر منیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا